تبصرہ کتب

نعیم احمد بلوچ

تہذیبی نرگسیت

مصنف: مبارک حیدر

صفحات: ۱۳۹، مجلد

قیمت: ۱۵۰ روپے

اشاعت: ۲۰۰۹

پبلشرز: سانجھ، ٹمپل روڈ لاہور

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کم وبیش ہر معاشرے میں کوئی نہ کوئی فکری ونظری بحث جاری رہتی ہے۔ اس کی نوعیت البتہ ایسی کبھی کبھار ہی ہوتی ہے کہ اس پر قوموں کی بقا کا دورومدار ہو، مثلاً انقلاب فرانس (1789–1799) میں نظام حکومت کی بحث، ابراہم لنکن (1861 – 1865) کے دور میں غلامی کی بحث، جنگ عظیم دوم کے بعد (1945) آزاد انڈیا کو اقتدار کی منتقلی کی بحث وغیرہ۔ قومیں اگر ان بحثوں کے بعد کسی متفقہ نتیجے پر نہ پہنچیں یا سامنے کی حقیقتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیں تو پھر فرشتوں کے وہ خدشات مجسم حقیقت بن جاتے ہیں جو انھوں نے آدم کی خلافت کے خدائی منصوبے کے وقت ظاہر کیے تھے اور قتل وغارت گری کے ایک سیلاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان بھی اس وقت ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ ہماری جنگ ہے یا امریکہ کی، طالبان اسلامی انقلاب کا ہراول دستہ ہیں یا مخصوص فہم اسلام کے بزور نفاذ کی انتہا پسندانہ اور منتقمانہ جدوجہد۔ اسلامی انقلاب، اسلام کا نعرہ ہے یا حقیقت کچھ اور ہے؟ زیر تبصرہ کتاب میں ایسے ہی موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

۱۲۶ ابواب پر مشتمل اس کتاب کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے آٹھ ابواب میں مصنف نے انتہائی مہارت سے ان تمام سیاسی، تہذیبی اور مذہبی عقائد کا بے لاگ تعارف کرایا ہے جن کی بنیاد پر ہر ''باشعور

مسلمان‘‘ پاکستان اور پھر پوری دنیا پر غلبہ اسلام کے خوب دیکھ رہا ہے۔ عام طور پر ان نظریات کو مقدس قسم کی اصطلاحات کے لبادے میں بیان کیا جاتا ہے لیکن مصنف نے ’’حکومت الہیہ‘‘ ’’اظہار دین‘‘ ’’خلافت اسلامیہ‘‘ وغیرہ جیسی تراکیب کے تمام لبادے اتار کر اسلامی تحریکوں کی اصل منزل بیان کر دی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ان افکار پر کاٹ دار تبصرے بھی کرتے ہیں اور طنز و تعریض کے نشتر بھی چلاتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

’’یہ عجیب ہے کہ جب ہم موجودہ تحریکی نظریات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں تو عام قاری اسے طنز اور مزاح خیال کرتا ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ برہم بھی ہوں کہ اسلامی تحریکوں کو طنز کا نشانہ بنایا جا رہا ہے لیکن یہ ایک سوے اتفاق ہے جبکہ درحقیقت یہ نقشہ طنزیہ نہیں بلکہ یہ نظریاتی خاکہ اور تحریک کے مستقبل کا یہ پلان ایک ریسرچ پر مبنی ہے جو مختلف دینی طلباء اور اساتذہ سے رجوع کرنے کے بعد تیار کیا گیا ہے، جماعت اسلامی کے لٹریچر کے علاوہ اخوان المسلمین کے قائد سید قطب کی تحریروں کا مطالعہ کیا گیا ہے، بھارت، برطانیہ، سپین اور دیگر ممالک کی مسلم تنظیموں کے نعروں اور منشوروں کو دیکھا گیا ہے۔ یہ نظریاتی خاکہ حتی المقدور مبالغہ سے پرہیز کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے لیکن اس کے مبالغہ آمیز دکھائی دینے کی وجہ یہ ہے کہ آج کا عام پڑھا لکھا مسلمان جدید دور کی فکری تحریکوں سے متاثر ہوا ہے جن میں انسانی حقوق، آزادی رائے اور جمہوریت کے تصورات ایسے تصورات ہیں جن کے سامنے اسلام کے وہ تصورات ایک خاص انداز سے پس ماندہ دکھائی دیتے ہیں جو مدرسوں میں یا غلبہ اسلام کی تحریکوں میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا جب ان کا بیان ان کے اصل اور بے تکلف انداز سے کیا جاتا ہے تو شاید مزاحیہ، غیر سنجیدہ یا مبالغہ آمیز دکھائی دیتا ہے۔‘‘ (صفحہ: ۲۶-۲۷)

اسلام کے سیاسی غلبے کے لیے برسر پیکار مجاہدین کو پوری دیانتداری سے تلخ حقائق کا ادراک ان الفاظ سے کراتے ہیں:

’’اگر مسلم امہ کی فکری حالت نہیں بدلی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا بھی نہیں بدلی۔ صدیوں سے خود پسندی اور ملی فخر کے جس غار میں ہمیں سلایا گیا ہے وہ اس وقت ایک سفاری پارک میں بدل چکا ہے جس کے گرد ایک مضبوط باڑ ہے اور غالباً لوہے کی اس باڑ میں ہائی وولٹیج کرنٹ چھوڑ دیا گیا ہے جس کا کنٹرول روم ہمیں معلوم نہیں۔ ہم شیر ہیں، ہم شاہین ہیں، ہم غازی ہیں اور شہادت ہماری آرزو ہے، لیکن اس دنیا کی اقوام اس جنگل سے نکل آئی ہیں جہاں ہم بادشاہ تھے۔ اب ایک اور طرح کا جنگل ہے جہاں ہم سے بھی بڑی بلاؤں کی حکومت ہے، ہم ان بلاؤں کی تفریح گاہ میں رہتے ہیں اور یہ بلائیں اپنے تفنن طبع کے لیے اس سفاری پارک میں کبھی چنے پھینکتی ہیں اور کبھی کنکر، کیونکہ ان کے حساب سے ہم شیر بھی نہیں، بلکہ محض چنے چبانے والی کوئی مخلوق ہیں، جن سے وہ کبھی کبھی اپنے عوام کو ڈرانے کا کام لیتی ہیں‘‘۔ (صفحہ ۲۳ - ۲۴)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کتاب کے اس حصے سے ہم ان دو اقتباسات ہی پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ سچی بات یہی ہے کہ ان ابواب کا لفظ لفظ وہ آئینہ ہے جس میں بسم اللہ کے گنبد میں بند اسلامی تحریک کے دانشور اور کارکن، دونوں ہی اپنا وہ چہرہ دیکھ سکتے ہیں جو ان کے ناقدین کے ہاں ان کا اصل تشخص ابھارتا ہے۔ مصنف نے جا بجا اپنے مخاطب سے چبھتے ہوئے سوالات بھی پوچھے ہیں اور زبان حال سے دریافت کیا ہے ان سامنے کے حقائق کو نظر انداز کر کے کسی صائب فیصلے پر کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں:

''کیا قومی آزادی کسی دوسری قوم سے نفرت کے بغیر ممکن نہیں؟ کیا جدید جاپان، ملائیشیا یا چین کی ترقی کسی مخالف قوم سے نفرت کی بنیاد پر ہوئی ہے؟ کیا بھارت سے نفرت کے نتیجے میں یا اسلام کا بڑھ چڑھ کر نعرہ لگانے سے ہم نے پچھلے ساٹھ برس میں ترقی کی ہے؟'' (صفحہ ۴۱)

تبلیغی جماعت سے پوچھتے ہیں:

''دوسرے ملکوں میں جانے سے پہلے آپ اپنے ملک کے عوام کا کردار اور اخلاق کیوں نہیں سنوارتے؟ اور جب تک یہ سنور نہ جائے، کیا آپ کا بیرون ملک جانا جائز ہے؟'' (صفحہ ۴۴)

جہادی مذہبی قیادت سے پوچھتے ہیں:

''ایسا (کیوں) دیکھنے میں نہیں آیا کسی چیرہ دست ظالم کو، کسی ذخیرہ اندوز کو یا ہیبت ناک مالی سکینڈل کے ذریعے راتوں رات ارب پتی بن جانے والے کسی شخص یا گروہ کو ان جہادی تنظیموں نے نشانہ بنایا ہو؟'' (صفحہ ۴۶)

کتاب کے دوسرے حصے میں مصنف نے اس مرض کی تشخیص کی ہے جو ان کے خیال میں ہم مسلمانوں کے ہاں ہر سطح پر پایا جاتا ہے۔ باب نو سے سترہ تک وہ اپنے اسی مقدمے کے حق میں دلائل دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں مسلم ذہن میں خود پسندی اس حد تک سرایت کر چکی ہے ہم ''نرگسیت'' کے نفسیاتی مرض کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس کے حق میں متعدد علماے نفسیات کے حوالے سے انھوں نے ۱۱۶ ایسے خصائص بیان کیے ہیں جو نرگسیت کے مریض میں پائے جاتے ہیں۔ پھر انھوں نے تجزیہ کر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ساری علامات مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ مصنف کو احساس ہے کہ ہر دور کی عالمی طاقت اسی طرح کی ذہنیت کا مظاہرہ کرتی ہے لیکن ان کے نزدیک موجودہ عالمی طاقت امریکا کا معاشرہ اس کے مضر اثرات سے بوجوہ محفوظ ہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امریکہ میں بہترین جمہوری حقوق کے مروج ہونے کے باوجود یا شاید ان کی وجہ سے امریکی فرد کی انفرادی نرگسیت اور امریکہ کی ریاستی نرگسیت میں وہ یکسانیت پیدا نہیں ہو پاتی جو پاکستان یا سعودی عرب کے کرخت آمرانہ معاشروں میں ملتی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اظہار رائے کی آزادی اور اختلاف کا حق اس امر کی ضمانت بنتے ہیں کہ ہر طرح کی نرگسیت پر تنقید اور نگرانی ہوتی رہے چنانچہ فرد کی نرگسیت پر اجتماعی چھاپ نہیں لگتی۔اس کے برعکس آمرانہ معاشروں میں چونکہ قبائلی جبر اور آمرانہ نظام فرد کی آزادانہ نشوونما کو روکتے ہیں اور معاشرہ تنوع سے محروم ہو جاتا ہے لہٰذا فرد اور معاشرے کی نرگسیت میں یکسانیت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے'' (صفحہ ۶۴)

لیکن اس موقع پر قاری کے اس فطری سوال کا جواب نہیں دیا گیا کہ عراق کے خلاف بلا جواز جارحیت کے متوقع اقدام کو جب ان جمہوری معاشروں نے رد کیا تو کیا تو اس کا لحاظ نہ کرنا کون سی جمہوری روایت کے مطابق تھا؟ کیا اس موقع پر امریکا کی ریاستی نرگسیت کے آگے امریکی، برطانوی، فرانسیسی اور دوسری متعدد یورپی اقوام کی انفرادی نرگسیت کوئی موثر بند کیوں نہ باندھ سکی؟ البتہ انھوں نے مسلم نرگسیت کی یہ وجہ بہت خوب بیان کی ہے:

''مملکت سے بغاوت کے جو مظاہر پاکستان میں دکھائی دے رہے ہیں وہ صرف ایک ایسے نرگسی معاشرے میں ممکن ہے جہاں فرد یا گروہ خود کو مملکت سے بڑا یا برابر سمجھتا ہے اور دوسری طرف مملکت فرد کو کسی آئینی اور قانونی اصول سے تبدیلی کا موقع فراہم نہیں کرتی، یعنی فرد اور مملکت اپنی اپنی نرگسیت کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب قوم اور مملکت کے تصورات افراد کی نظر میں قبل احترام تصورات نہ ہوں بلکہ ان کی جگہ کسی دوسرے تصور اجتماعیت کو تقدس حاصل ہو۔ چونکہ پاکستانی معاشرے میں فکری طور پر مذہبی حکمرانی کو تقدس حاصل ہے اور عملی طور پر جابر اور عسکری قوت کو یہ حق حاصل ہے لہٰذا قومی اور ملکی تشخص بتدریج بے معنی ہوتا جا رہا ہے۔'' (صفحہ ۶۳۔۶۴)

کتاب کے آخری نو ابواب میں مصنف نے اپنی رائے کے مطابق ان غلط افکار کی نشان دہی کی ہے جس کی وجہ سے مصنف کے بقول مسلمان نرگسیت کا شکار ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں اسلام کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کے خود ساختہ عقیدے کو بجا طور پر ہدف تنقید بنایا ہے۔غلبہ اسلام کے عنوان سے انھوں نے اس بات کو سادہ انداز سے رد کر دیا ہے بھلا آج کے دور میں سر فتح کر کے غلبے کی آرزو کیسے پوری کی جا سکتی ہے؟ اور ان کا یہ کہنا بھی سو فی صد درست ہے کہ آج اگر حضور ﷺ خود موجود ہوتے تو وہ نام نہاد جہادیوں کی پر تشدد تحریکوں کے بجائے سفارت اور مکالمے کے ذریعے دل و دماغ کو فتح کرنے کو ترجیح دیتے۔ جہاد اور سنت کے مروجہ تصورات پر بھی ان کی تنقیدات جان دار اور قاری کو اپنے دل کی بات محسوس ہوں گی البتہ انھوں نے دین اسلام میں سنت اور جہاد کا جو تصور بیان کیا ہے اس سے اتفاق کرنا مشکل محسوس ہوگا۔

یہ درست ہے کہ مصنف نے عمومی طور پر عقل عام ہی کے ذریعے اپنے تجزیے کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے ہیں لیکن بعض جگہوں پر انھوں اس مناسب روش سے ہٹ کر خالص

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

علمی وفنی نوعیت کی تنقید بھی کی ہے لیکن ایک تو کتاب کا اسلوب اس کے لیے مناسب نہیں ہے دوسرے یہ کہ شاید زیر بحث موضوعات سے انصاف کے تقاضے پورے کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ مثلاً صفحہ ۹۲ پر انھوں ایک عربی مقولے کو حدیث قرار دیا ہے کہ علم حاصل کرو چاہے تمھیں چین جانا پڑے (ملاحظہ ہو کتاب: مقالات عبدالقدوس ہاشمی)، اسی طرح نوشیرواں عادل ایرانی ضرور تھا لیکن اس کا عدل کسی تہذیبی روایت سے ماخوذ نہیں تھا بلکہ اس کی ساری اخلاقیات کا منبع اللہ کی دی ہوئی فطرت اور اس کے انبیاء کی تبلیغ کردہ تعلیمات تھیں اور قرآن نے اس کا ذکر ذوالقرنین کے لقب سے کیا ہے۔ اور اس کی حکومت ہرگز عربوں نے ختم نہیں کی (تفسیر ترجمان القرآن از مولانا ابوالکلام آزاد) سنت کے حوالے سے ان کے ارشادات خلط مبحث کا شکار ہیں۔ یہ تو بالکل درست ہے کہ بطور نبی آپ کا اسوہ مبارک اور بطور انسان آپ کے وہ اعمال جو آپ نے ذاتی حیثیت سے انجام دیے، ان میں فرق کیا جائے گا، لیکن سنت کی متعین تعریف کیا ہوگی، اسے انھوں نے بیان نہیں کیا۔ بدر کے قیدیوں کے متعلق حضور ﷺ کا فرمان سورہ محمد کے عین مطابق تھا، اور اس پر اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ کسی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا، ناپسندیدگی والی روایت درست نہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے ''حیات رسول امی'' از خالد مسعود) حضرت عائشہ صدیقہ سے کنارہ کشی حضور ﷺ کا فیصلہ نہیں بلکہ ازواج مطہرات سے متعلق خاص قانون کا ایک مرحلہ تھا، جسے اللہ کے حکم سے اختیار کیا گیا تھا۔ (دیکھیے میزان از جاوید احمد غامدی، صفحہ ۴۷۱)۔ اسی طرح صفحہ ۹۷ میں بیان کردہ اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہے کہ جید صحابہ نے حضرت عثمان کو خلافت سے دست بردار ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ دراصل وہ تو فسادی اور باغی یہ کہہ رہے تھے کہ آپ خلافت سے علیحدہ ہو جائیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں ''خلافت معاویہ و یزید از علامہ عباسی) روح کے حوالے سے بھی انھوں نے جو بیان کیا ہے اس سے متفق ہونا مشکل ہے۔ قرآن میں روح کا لفظ چار دفعہ آیا ہے، وہاں یہ لفظ پھونک، امر ربی، وحی اور جبریل علیہ السلام کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، جبکہ فلسفے میں روح کا لفظ اس اصل انسانی شخصیت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو جسم سے ماورا ہے۔ یونانی اسے soul کہتے تھے اور قرآن میں اسے ''نفس'' کہا گیا ہے، لیکن مصنف کے مطابق: ''جسے ہم روح کہتے ہیں، وہ غالباً ذہن کا ایسا طبقہ ہے جو اجتماعی شعور کو عالم نامعلوم سے جوڑتا ہے''۔ یوں ''مذہب بطور روحانیت'' میں ان کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا اور یہ قاری کے لیے خاصی الجھن کا باعث ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ڈارون کی کتاب Origion of Species جس دن (24 نومبر 1859) مارکیٹ میں آئی اسی دن فروخت ہوگئی۔ غیر معیاری نثر میں لکھی گئی اور انتہائی متنازعہ موضوع کی حامل کتاب ہونے کے باوجود اس کی پذیرائی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نے ثابت کر دیا تھا کہ آیندہ صدی میں یورپ علم وفنون کا امام ہوگا۔ زیر تبصرہ کتاب اگر چہ خوب صورت نثر کا ایک معیاری نمونہ ہے اور اس میں بیان کے گئے تلخ حقائق، اٹھائے گئے لاجواب سوالات، دکھی دل کے ساتھ بیان کیے گئے تیکھے نکات اور مستقبل میں پیش آنے والے چونکا دینے والے تباہ کن نتائج کو جس مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کے باوجود اس کی جتنی پذیرائی عوامی حلقوں میں ہوئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے آنے والے وقتوں میں ہمارا کیا حشر ہوگا۔ بلاشبہ اپنی تمام خامیوں کے باوجود یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے پاکستان کا ہر وہ فرد غور سے پڑھے جو یہ جاننے کا مشتاق ہے کہ قومیں قرآن کے الفاظ میں ''مغضوب'' اور ''ضالین'' کیسے بنتی ہیں۔ اپنے آپ کو فکری اور علمی احتساب سے ماورا سمجھنے والے اذہان جہالت کی کن پستیوں میں جا گرتے ہیں اور ان کے دل سامنے کی حقیقتوں کو قبول کرنے سے کیسے گریزاں ہو جاتے ہیں۔

خوب صورت طباعت اور بامعنی سرورق کی حامل اس کتاب میں چھیڑے گئے موضوعات پر اس طرح کی کئی کتب منظر عام پر آنے چاہییں تا کہ فکری گھٹن میں کچھ تو کمی ہو۔ اس سلسلے میں مصنف کی یہ کاوش انتہائی مبارک اور قابل صد ستایش ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org